

ادبی تاریخ نویسی اور ادبی متون کے معنیاتی واسطے میں کشادگی کے امکانات (مادام استیل کا ادبی سماجیاتی تفکر)

Abstract:

Literary Socialism is not a new theory in west but obviously little unknown in Urdu literature. This literary theory discuss the creative text not only in the absence of creator or not by the environment where this text created. In Urdu literature we need to re-criticise our poetry and fiction in the light of literary socialism. Literary Socialism discuss the total frame of text created and person who creates this one, this theory firstly in history of literature discusses the public and private offices which take part in the creation of literature likely Anjuman e punjaab, Halqa Arbab e Zauq, Progressive Writers Forum. In this article you can know about madam stael, the founder of this theory and others. In this article we discuss the Neo-Colonial socio political part of Sir Syed Ahmad Khan, Altaf Hussain Hali, M Hussain Azad and the present situation of creative works of Urdu literature and point out the inner side of that political era. In this article critically random technique is used to express basic concept and central point of Discourse that is the reason at some places repetition may proceed but it contains due to make article interesting. We try to not be a formal and express the whole theory with simple critic upon Urdu literature and also divide it into pieces so from the start till end the article carry different particular of literary theory and also about prominent Urdu literature. Hope article can express the basic idea upon which it is based. Regarding references it took some special policy as we use

some basic content with some most famous critics of the time but article is not full with refrence and code un code but writer try to make his own opinion.

Keywords:

Literary Socialism, Literature, Culture, Socialism, Discourse, Criticism

سرمایہ دارانہ عہد نے انسان کی تخلیقی توانائی کو شدید نقصان پہنچانے کے علاوہ اس کی جمالیاتی صلاحیت کو بڑے پیمانے پر متاثر کیا ہے۔ تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو یہ پہلو کھل کر سامنے آچکا ہے کہ سرمایہ ہی وہ دیوار ہے جو سچائی اور انسان کے درمیان بلند ہو جاتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے معاصر عہد میں انسان کی سماجی ضروریات اور اس سے وابستہ نفسیات کو بڑی حد تک متاثر کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جس نے انسان کے اطراف موجود اشیاء اور مظاہر کو نئے انداز پر پیش کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور خود بھی اس عمل کی کوشش کی یہ سرمایہ دارانہ منظر نامہ ہے جس میں انسان نے ترقی، تہذیب، عروج، زوال، حاکمیت، غلامی، آزادی، طاقت، فطرت، حسن، وقار، عزت، اعتماد، بھروسہ، شعور، موجود، لاموجود، نیک، بد، ادب، سائنس، دینیات، فلسفہ، بشریات، کونیات، طبعیات، مابعد طبعیات سمیت زندگی کے ہر شعبہ کو نئے معنی پہنانے کی سعی کی۔ اس عمل میں ہر نئی کوشش کو جدت اور جدیدیت کی اصطلاحات میں لپیٹ کر پیش کیا گیا۔ جدیدیت جس کے لیے جدید، نادر، موجود، تجدید، تجدید کے الفاظ بھی استعمال میں لائے جاتے ہیں، جبکہ تقلید پرستی، ضد اور کٹر پن، روایت پسندی، تقدیر پرستی، ضعیف الاعتقادی، دقیانوسی پن ایسی تراکیب اس کے متضاد کے طور پر فہم میں رکھی جاتی ہیں، نے اپنے مجموعہ افکار میں ایک یہ نکتہ بیان کیا کہ اشیاء ایک اسرار کی طرح ہمارے چہار اطراف پر ت اندر پرت، نقاب اندر نقاب، پیچیدہ، مبہم، سادہ، واضح سمیت کئی مختلف شکلوں میں وجود کو رکھے ہوئے ہیں جن کو درست طور سے سمجھنے کے لیے سچ سچ کر آگے بڑھنے اور احتیاط کے ساتھ قدم اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بھی سچائی ہے کہ جدیدیت نے انسان کو حقیقت کے ادراک کی سعی پر معمور کیا (لیکن سچائی کا وہی رخ جو سرمایہ دار کے مزاج اور سرمایہ دارانہ ضرورت سے ہم آہنگ ہو) اور انسان اپنی پوری صلاحیت سے اس کی تلاش میں جت گیا مگر سرمایہ داری معاصر عہد کی وہ کسوٹی ہے جو اپنے سوالات اور اپنے نشانات کے اندر بھول بھلیوں اور شکست و ریخت کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ رکھتی ہے یہ ایسی طویل اور پیچ دار لوط بوٹی ہے جو اپنے سے جڑی اشیاء کو بہت جلد اپنی لچکدار، نرم و گداز کھال میں ایسا لگن کرتی ہے کہ وہ یہ دیکھنے میں اکثر بھول کر جاتا ہے کہ یہ ہزار چہرہ بلا بے جڑ کی لوط ہے جس کی اپنی جڑ بھی نہیں اور اپنا خوراک کا نظام بھی نہیں ہے بلکہ یہ اس جڑ سے ساری خوراک اور پانی کشید کر رہی ہے جس نے اس کو زندگی دے رکھی ہے اور آخر کار یہ اپنے محسن کے پورے تن بدن سے زندگی اور چاشنی کی آخری بوند تک نچوڑ کر اس سے چلتی بنے گی۔ یہی وہ عمل ہے جس سے آج کا انسان بالخصوص تیسری دنیا کا استعمار زدہ انسان دوچار ہے جس کی زمین، ادب، فلسفہ، ظلم، انصاف، امن، بے امنی، خوف، اطمینان، داخلی کرب، خارجی سکون، باہمی رواداری، باہمی نفاق، اتفاق، نا اتفاقی، سماجیات، افکار، نظریات، دینیات، اساطیر، واہموں، ایقان سمیت ہر گوشہ حیات کے گرد گرد ایک لوط بوٹی لپٹی ہوئی ہے جس نے آخر کار اس کو زمین سے

اکھاڑ پھینکنا ہے۔ عراق کی مثال لیں، کویت کے حالات دیکھیں، صدام حسین، کرنل قذافی ایسے ایک وقت کے ہیرو اور دوسرے وقت کے عبرتناک انجام سے دوچار شخصیات کے حالات کو جائزہ لیں، ہر طرف امن کی آشاء کو تھام کر، قدامت کے جبر سے آزادی کا نعرہ لگا کر، انسانوں کی بھلائی کی فکر مندی میں ہلقان ہوتے ہوئے، جدید زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کا دعویٰ بلند کرتے ہوئے کس طرح استعمار اپنی استعمار زدہ زمینات میں داخل ہوتا ہے اور اپنے من کی چاہی تعریف کرتے ہوئے اپنے مزاج کے مطابق امن اور آتشی قائم کرتا ہے۔ جدیدیت کا زمانہ عالمی سطح پر برطانیہ اور امریکہ کی سامراجی اجارہ داری کے عروج کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں اشیاء کے تصورات، ان کی جزوی اور کلی حالتیں، سیاسی سماجی صورت حال، کثیر الاقوام تجارتی کمپنیاں، سائنس اور اسلحہ کے متعلقات اور اس سے وابستہ حیرت ناک کو امریکہ اور اس کے اتحادی سامراج نے اپنی مرضی کی تفہیم دینے کے لیے اسلحہ کی نمائش اور استعمال کے علاوہ ادب اور فلسفے کو بھی اپنے نوآبادیاتی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا ہے۔ ہمارا یہ مقالہ اردو ادب کی رائج تنقیدی روایت پر کچھ سوال کرتے ہوئے، اردو کے دو اہم بنیاد گذاروں سرسید احمد خان اور مولانا الطاف حسین حالی کی فکریات پر ابتدائی نوعیت کا ڈسکورس قائم کرے گا۔ اس مطالعہ کا مقصد کسی اختلاف کو پیدا کرنا یا ہوا دینا نہیں ہے نہ ہی اس سے کسی سطح پر سرسید احمد خان اور الطاف حسین حالی کی شخصی عظمت پر کچھ اچھا لانا ہے بلکہ ہمارا یہ مقالہ ان شخصیات کے متون کے مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی سماجیاتی نکات کی رو سے ان کے سماجی سیاسی حالات کو منظر نامے میں رکھ کر ان نکات کو سامنے لانا ہے جو دیوار کے پیچھے موجود ہوتے ہیں۔ اگر اس عمل سے ان شخصیات کے عمومی تاثر میں کوئی بدلاؤ آتا ہے یا اردو خاندان اپنے ماضی کی یادگار پر غور و فکر کی کوشش کرتا ہے تو گویا اس مقالے نے اپنے حصے کی ذمہ داری کو ادا کیا اور گراں گزشتہ کچھ نہیں ہوتا تو اس ضمن میں مزید تحقیق و تجزیات کے درکھولنے کے امکانات کو دیکھا جانا چاہیے۔ اس مقالے میں ہم نوآبادیاتی عہد میں تخلیق کردہ ادب کے پس پشت سامراج کی عیاری کو سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ فورٹ ولیم کالج سے آغاز پانے والی یہ سامراجی حکمت عملی ہندوستان کی اجتماعی نفسیات کو کس طرح نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی ہے اور ہمارے یہ دو بزرگان ادب اس کاوش میں کس طرح معاون رہتے ہیں۔ انجمن پنجاب تک آتے آتے حالی کے رفیق کار مولانا محمد حسین آزاد نے کس طور استعمار کار کے ہاتھ مضبوط کیے۔ اس سلسلے میں اٹھارہویں صدی میں فرانس کے سیاسی سماجی ماحول اور فرانسیسی ادب سے رواج پانے والی ایک ادبی تحریک ادبی سماجیات کے اصولوں کی روشنی میں اردو ادب کی تنقید کا جائزہ لیا جائے گا۔ مقالے کے دوسرے باب میں جدید ادبی نظریات میں تخلیق کار کے وجود کو نفی کرنے کی کوششوں اور اس ذیل میں ہندوستان میں تخلیق کار کی سیاسی عمل داری پر بھی تفصیل سے بات کی گئی ہے مگر آپ کے روبرو موجود اولین حصے میں ادبی سماجیات کی نظری تفہیم اور اس کے اطلاقی پہلوؤں پر بات کی جائے گی۔ اردو کے سنجیدہ قاری کے لیے یہ امر باعث دل چسپی ہوگا کہ ادبی سماجیاتی نکات کی روشنی میں سرسید احمد خان اور الطاف حسین حالی کے ادبی معرکے اپنی فکری اساس میں برطانوی راج کے حمایتی اور ہندوستان کی مجموعی ادبی روایت سے اردو ادب کو الگ کرنے کی کوشش دکھائی دیتے ہیں جس پر آئندہ سطور میں بات ہوگی۔ اس تحقیقی تجزیاتی عمل کے لیے بنیادی علمی ذرائع میں ادبی سماجیات کے نظریات اور اس کے بنیاد گذاروں پر راقم کی مرتبہ کتاب ادبی سماجیات، تصور اور تعبیر شامل ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر محمد حسن کی کتاب ادب کی سماجیات، عائشہ بیگم کی

کتاب تاریخ اور سماجیات اہم حوالوں کے طور پر استعمال کی جائیں گی۔ ہندوستان میں ادب کی روایت اور تنقید کی دو ہزار سالہ تاریخ کی تفہیم کے لیے غبر بھراچی کی کتاب آئندہ دور میں اور ان کی شعریات سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔ سرسید احمد خان کی ادبی حیثیت اور سیاسی سماجی مرتبے کا جائزہ لینے کے لیے سلیم الدین قریشی کے مدونہ رسالہ اسباب بغاوت ہند، شافع قدوائی کی کتاب سوانح سرسید سے مفروضہ کی تشریح و تفہیم کے لیے استدلال کیا جائے گا۔ یہ امر ماننے میں کوئی تامل نہیں کہ موضوع اپنی اساس میں وسعت آمیز اور پیچیدہ ہے جس پر کام کرنے کے لیے خاص علمی محنت اور عقلی، استدلالی اجتہاد کی ضرورت ہے ہم نے خاص کوشش کی ہے کہ انفرادی تعصب سے گریز کرتے ہوئے علمی مباحث کو مکمل محنت اور جانفشانی کے ساتھ اردو کے قاری/ ناقد تک پہنچایا جائے۔ ادبی سماجیات کی بنیاد گزار ”مادام استیل نے سیاست سے ادب کے رشتے پر بہت زور دیا ہے۔ عصری فرانسیسی ادب پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ فرانس کی سیاست میں ابھرتے جمہوری فکر کا فرانسیسی ادب میں اظہار خیال ضروری ہے۔ اس وقت فرانسیسی ادب میں لوگوں کو، خصوصاً کسانوں کو فاقہ کشی کا کردار سمجھا جاتا تھا۔ ان کو صرف کامیڈی کرداروں کی شکل میں ہی ادب میں جگہ ملتی تھی۔ اس روش کی مخالفت کرتے ہوئے مادام استیل نے لکھا ہے کہ عوام اور کسانوں کو ٹریجڈی جیسی سنجیدہ صنف میں مرکزی کرداروں کی شکل میں پیش کرنا ضروری ہے۔ اس نے ادب میں اہم سماجی تبدیلیوں کے اظہار کا مطالبہ کرتے ہوئے انصاف اور آزادی کے لیے چلنے والی تحریکوں کی تصویر کشی کو لازمی قرار دیا ہے۔“ (1)

ادبی سماجیاتی تحریک کی بنیاد گزار اور متحرک سیاسی و ادبی کارکن، مادام استیل اٹھارہویں صدی کے فرانس کا وہ اہم حوالہ ہے جو ادب اور سماج کے باہمی روابط کی تلاش و بسیر کے علاوہ ادبی متون میں معاشرے کے مختلف کرداروں کی متناسب نمائندگی کی قائل ہے یہ وہی تفکر ہے جو ہمیں بیسویں صدی کے انگلستان میں ایڈراپاؤنڈ، ٹی ایس ایلٹ اور ان کے دوست تخلیق کاروں کی کوشش سے پختہ ہوا نظر آتا ہے۔ ایڈراپاؤنڈ نے شمالی کارشعرا کی تحریک ۱۹۰۸ء کے توسط سے انگلستان میں رائج شاعری کی روایت کو رد کیا اور شعرا سے نئی ترتیب پاتی مادی زندگی میں سماج کے ساتھ وابستگی کا مطالبہ کیا۔ ادبی سماجیاتی تحریک کے مبنی مطالعات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ وہی سماج فکری تفاعل ہے جس کی بنیادانیسویں صدی میں مادام استیل نے رکھی۔ وہ عورت اور مرد، کسان اور مزدور، سیاست دان اور عام آدمی کے رشتوں کی باہمی اساس کا ادبی ڈھانچے میں پیش کرنے کی خواہاں ہے تاکہ معاشرہ کے فعال کردار ادبی متون میں اپنی حقیقی شکلوں کے ساتھ موجود ہوں۔ مادام استیل نے اپنے مضامین اور تحریروں میں ادب پر مذہب، اخلاقیات اور قانون کے اثرات کو جانچنے کی کوشش کی، مادام کے یہ تنقیدی تصورات نئے بھی تھے اور جدید مادی سماج میں معاصریتی عمل کے لازمی اجزاء بھی، لہذا ان کی اہمیت سے کسی طور انکار ممکن نہیں تھا۔ مادام نے ادب پر سماجی اداروں کے اثرات اور ان اداروں کی کوشش سے سامنے آنے والے ادب پر کھل کر بات کی۔ اس نے تانا شاہی سرکار کے خلاف اپنی سیاسی سرگرمی میں اپنا انسان دوست جمہوری موقف پیش کیا۔ تانا شاہی حکمرانوں کو استیل کی فکر قابل قبول نہ تھی اور ریاست کے دباؤ پر انہیں اپنا ملک چھوڑنا پڑا۔ اردو ادب میں آج اہم سوال یہ ہے کہ ادب میں متفرق سماجی کرداروں کا جائزہ کس سیاسی، سماجی، تنقیدی، ثقافتی تفکر کی بنیاد پر لیا گیا ہے؟ کیا اردو ادب میں ایسے تنقیدی حوالے موجود ہیں جو تخلیق کار اور ادب کو سماجی کی تمام چھوٹی بڑی اکائیوں کے عملی تفاعل کے ساتھ

تجزیہ کرتے ہوں؟ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ استیل نے پہلی مرتبہ ادب کی مادی بنیاد اور سماجی عمل میں اس کے تفاعل پر کھل کر بات کی ہے۔ مادام نے اپنے علمی مخاطبے میں کسی بھی خطے اور کسی بھی زبان کے ادب کے سماجی وجود اور ریاستی اداروں کی عملداری سے ادب پر ہونے والے اثرات کا پوری تفصیل سے جائزہ لیا ہے کہ جب بھی کوئی ادب ریاست کی دلچسپی سے سامنے آتا ہے تو اس میں ریاست کی منشاء کا دخل عوام کی خواہشات کے اظہار پر بازی لے جاتا ہے اور یوں یہ ادب ریاست کا نمائندہ ادب بن کر رہ جاتا ہے۔ اس نوعیت کے مطالعات سرسید احمد خان اور مولانا الطاف حسین حالی کے مصنفہ متون کے بھی ہونے چاہیں تاکہ اردو کی تاریخ کو سماجی جدلیات کی نگاہ سے دیکھنے کی روایت مضبوط ہو سکے۔

اردو ادبیات کے جنوبی علاقہ جات کی ایک اہم اور بڑی زبان ہے۔ ہندوستان اپنے قدیم لسانیاتی ڈھانچے میں درواڑی زبانوں کے تال میل سے سماجی تفاعل کو آگے بڑھاتا ہے۔ ان درواڑی زبانوں میں ہندی، تامل، گجراتی سمیت متفرق زبانیں مختلف علاقہ جات میں رائج ہیں۔ مسلمانوں کی ہندوستان آمد پر یہاں کے شمالی علاقہ جات میں اردو کی پیدائش کے اسباب پیدا ہوتے ہیں۔ اردو ہندوستان کی مقامی زبانوں ہندی، عربی، فارسی کی مجموعی ترکیب پر اپنی تشکیل کے مراحل سے گزرتی ہے۔ اردو اور ہندی میں تفریق مشرقی بھارتی کمپنی (East India Company) کے نوآبادیاتی اثرات کے تحت منظر عام پر آتی ہے جس کا بیج یقیناً بنیاد میں موجود تھا جس کو انگریز راج نے پال پوس کرتا ہوا اور اس سے ممکنہ سیاسی فوائد حاصل کیے۔ اس سیاسی جدید کاری کے عمل میں تہذیبی شعور کو نئے سیاسی منظر نامے کے تحت ڈھالنے کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے خاص سعی کی گئی جس کی شروعات فورٹ ولیم کالج کی ترجمہ کاری کی تحریک سے آغاز پاتی ہے اور دلی کالج میں جان گلکرسٹ کی سربراہی سے اپنے اثرات مرتب کرنا شروع کرتی ہے۔ ادبی سماجیاتی مفکر فورٹ ولیم کالج اور میرامن کو اردو ادب کے انقلابات کہنے کی بجائے، اس عہد کی سیاسی سماجی صورت حال، ان اداروں کی سماجی ضرورت، ان اداروں کی سیاسی ضرورت، یہاں ترجمہ ہونے والے ادب کی سیاسی سماجی حیثیت بارے احتیاط اور توقف سے سوچے گا۔ اس کے لیے میرامن سادہ کاری کی نثر نگاری کا بنیاد گذار نہیں بلکہ انگریز راج کے استحکام کی کوشش میں جتے مختلف کرداروں میں سے ایک کردار ہوگا۔ یہ نکتہ بھی توجہ کے قابل ہے کہ اردو ادب کی روایت میں میرامن، سرسید احمد خان، الطاف حسین حالی، محمد حسین آزادان کرداروں میں شامل ہیں جنہیں ایک رائے میں ہندوستانی مسلمانوں کا محسن، نئے ادب کے بنیاد گذار، مسلمانوں کی سماجی سیاسی زندگی کے غیر معمولی پڑاؤ گردانتے ہیں جبکہ ایک نکتہ نگاہ یہ ہے کہ یہ نمائندہ کردار انگریز کے نوکر، ذہنی اور فکری غلام اور ہندوستان میں انگریز راج کی وسعت کی کوشش میں مصروف عمل کردار ہیں۔ اپنی اصل میں ہندوستانی سماج کی یہی پیچیدہ نفسیات اسے دوسرے ادبی، سیاسی معاشروں سے مختلف بناتی ہے۔ انگریز راج کے زمانے میں مسلمانوں کی نفسیات بارے ڈاکٹر علمدار بخاری کی رائے توجہ کے لائق ہے:

مغرب کی نوآباد کاریوں میں بسنے والے لوگوں کا طرز عمل بڑا پیچیدہ ہوتا ہے، نوآباد کاروں کے سازشی اور جابرانہ دور اقتدار میں عموماً ان کا رشتہ غیر ملکی حکمرانوں / آقاؤں کے ساتھ محبت۔ نفرت (love hate) کی پیچیدہ صورت حال میں منقلب ہو جاتا ہے۔ وہ خود اپنے مغربی سفید آقاؤں جیسا علم اور طاقت حاصل کرنا چاہتے ہیں کیوں کہ انہیں گزرتے وقت کے ساتھ یقین سا آ جاتا ہے کہ ایسا کیے بغیر وہ غلامی کے شکنجوں کی گرفت کو ڈھیلا نہیں کر سکیں گے اس

طرح وہ غیر شعوری طور آقاؤں جیسا ہی بننا چاہتے ہیں حالاں کہ اسی وقت وہ اپنے آقاؤں سے نفرت بھی کر رہے ہوتے ہیں، آقاؤں کے جس روپ اور جن فضائل سے وہ نفرت کرتے ہیں دراصل وہی ان کی غیر شعوری خواہش ہوتے ہیں۔ (۲)

اس صورت حال کا اطلاق انگریز راج کے استحکام کے بعد لکھے جانے والے ادب پر کیا جاسکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا سرسید احمد خان اور اس عہد کے دیگر مصنفین جیسے حالی، آزاد کے ادب میں موجود اس پیچیدہ صورت حال پر پوری توجہ سے کام کیا گیا ہے؟ کیا ان تخلیق کاروں نے انگریز کے پیچیدہ سیاسی، اقتصادی، تہذیبی نظام کے خلاف واضح اور دو ٹوک الفاظ میں لکھا؟ کیا اس عہد کے نمائندہ تخلیق کاروں نے انگریز نوآبادیات یا انگریز استعماریت کی کھل کر مخالفت کی؟ اس سے آگے بڑھتے ہوئے کیا ہم نے نوآبادیاتی مطالعات میں سرسید سمیت تمام اس عہد کے مصنفین کے متون کا جائزہ، ان تمام عقلی، سیاسی، سماجی اسباب کے ساتھ لیا جو ان تخلیقات کے متعلقات ہیں؟ ہمارے پاس ان تمام سوالات کے معذرت خواہانہ جوابات تو ہو سکتے ہیں جیسا کہ خود سرسید ان کے رفقاء اور اس زمانے کے دیگر انگریز نواز مصنفین کے پاس موجود تھے مگر کوئی دو ٹوک، واضح اور سادہ جواب تلاش کرنا شاید مشکل ہو جائے۔ ہم نے اپنی دانش کی ترتیب میں اس حد تک تساہل پرستی سے کام لیا کہ سرسید کے رسالہ اسباب بغاوت ہند پر ڈسکورس قائم کرتے ہوئے اس نوعیت کے مضامین کی روایت کو یکسر نظر انداز کیا۔ آج وہ وقت ہے کہ ہم اس نوعیت کے علمی ڈسکورس قائم کریں جن میں ادبی سماجیات کے نکات ہمارے لیے راہ نمائی کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ یہ امر واضح ہے کہ انگریز راج نے ہندوستان کی دو بڑی اقوام کو آپس میں منقسم کرنے کے لیے اولاً ہندی زبان کو مذہبی تناظرات میں ہندو اسلامی تہذیبی ورثے اور سماجی درجہ بندی سے منسلک کر کے اور پھر اسے سیاسی رسہ کشی کے لیے کامیاب آلہ کار (Tool) کے طور پر استعمال کیا۔ اس فکری تقسیم کے فوری اثرات میرامن کی باغ و بہار، حیدر بخش حیدری کی آرائش محفل جبکہ دوسری جانب سادل مشرا کی ناسکھیو پکھیاں اور لولوال کے پریم ساگر کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ ان متون کے متن قرب مطالعات سے ہندوستان میں مروجہ ثقافتی تنظیم جس کی رو سے مذاہب کی بنیاد پر نفرت کے عناصر نابید تھے اور یہاں مختلف مذاہب سے وابستہ لوگ صدیوں سے اپنی اپنی سماجی، مذہبی زندگی پوری آزادی کے ساتھ گزار رہے تھے مگر پھر بتدریج ایسا کیا ہوا کہ یہ فضاء مکدر ہونے لگی۔ یہ تراجم محض تراجم نہیں بلکہ وہ استعمار بنیاد اختلافی کڑیاں ہیں جو آج تک ہمارے معاشرے میں نوآبادیاتی مقاصد کی تکمیل کے لیے کسی نہ کسی صورت انگریز اقوام کے لیے معاون رہی ہیں اس سارے عمل میں اردو ادب اور اس کے فکری تناسبات کو اس کی زمین سے کاٹ کر مغرب کے ادب اور اس کے فکریاتی ڈھانچے کے ساتھ جوڑا گیا۔ آج اردو ادب کی ڈیڑھ صدی پیچھے کی روایت کا آج کی روایت سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ انگریز راج کے بعد اردو زبان اور اس میں تخلیق کیے جانے والے ادب کو خاص کوشش سے دراوڑی زبانوں سے کاٹ کر، ہند آریائی اور ہند یورپی زبانوں کے ساتھ پیوست کیا گیا جس کے فوری اثرات کا پھل ایسٹ انڈیا کمپنی نے اٹھایا اور آگے بڑھتے ہوئے یہ ساری صورت حال مابعد نوآبادی منظر نامے میں استعمار کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ آج ہم اردو ادب میں فکر و فلسفے کی تاریخ کے مطالعات مغربی تفکر اور یونانی کلاسیک سے کرتے ہیں باوجود اس کے کہ مغربی ادب سے قدیم ادبی روایات دراوڑی زبانوں کے ادب کی ہیں مگر ہمارا رشتہ آج نہ تو سنسکرت سے قائم ہے اور ناہی ہندی سے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہم آج فارسی اور عربی سے بھی کوسوں دور ہو چکے ہیں۔ اردو زبان و ادب میں مغرب پرستی

کی اس روایت کی ابتداء نثر کے میدان میں سرسید احمد خان اور شاعری / تنقید کے میدان میں مولانا حالی سے ہوتی ہے۔ سرسید و حالی نے محض اردو کو ہندی، سنسکرت، فارسی سے دور نہیں کیا بلکہ ان اصناف کو بھی کمتر ثابت کرنے کی کوشش کی جن کا رشتہ ان قدیم ہندوستانی زبانوں سے تھا۔ ادبی سماجیات اسی انداز پر ادب اور ادبی متون کے تجزیات کا نظام ہے جس میں تخلیق اور تخلیق کار کے ساتھ ساتھ ان کے ماحول، ان کے اطراف، ہمکنی زندگی، سرکاری اور نجی اداروں سے تخلیق کار کے روابط، اصناف کے انتخاب سمیت ہر اس شے، مظاہرے، قوت، سیاسی سماجی اکائی کا مطالعہ باریک بینی سے کیا جاتا ہے جو تخلیق کار یا تخلیق کی روایت سے جڑی ہوئی ہو۔ سرسید کے ان اثرات بارے آج کا نقاد لکھتا ہے:

”سرسید احمد خان سے اگلی نسل کا ذہنی ڈھانچہ اور حالات ان سے بالکل مختلف تھے۔ اس نسل کے اپنے فکری اور ادبی رجحانات تھے جو سجاد حیدر یلدرم کی رومانویت اور پریم چند کی حقیقت نگاری پر مبنی تھے جن کے ملاپ کے مختلف تناسبات بیسویں صدی کے اردو ادب کے ذیلی ادبی رجحانات کی صورت گری کرتے رہے۔“ (۳)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ سجاد حیدر یلدرم کی رومانویت اور منشی پریم چند کی اشتراکی حقیقت پسندی سے پہلے اردو ادب کے فکری رجحانات میں سماجی ربط کی شکلیں موجود نہیں ہیں یعنی قدیم اردو ادب سماجی تفاعل کے تخلیقی متشالوں سے خالی ہے۔ یہ وہی پہلو اور دعویٰ ہے جس کی نشاندہی انیسویں صدی کے آخرے عشروں میں الطاف حسین حالی نے یہ اعلان کر کے کی کہ اردو شاعری سادگی، اصلیت، جوش سے خالی ہے اور یہ اعلان کرتے ہوئے حالی نے خود سے بالکل پیچھے، زمانی ترتیب میں اولیت رکھنے والے نظیر اکبر آبادی کی شاعری کے موضوعات اور اس کے تکنیکی پیرائے پر نگاہ نہیں ڈالی۔ دکن میں شاعری کی پوری روایت سے شاید حالی اس طور آگاہ نہ ہوں مگر یہ کیسے ممکن ہے کہ دہلی سے چند میل کے فاصلے پر موجود ایسا شاعر جس کی شاعری زندگی کے متفرق رنگ سے مملو ہے حالی کی نگاہ سے اوجھل رہتا ہے۔ ہمارے ناقدین نے بھی حالی کے اعلان کی تعریف و توصیف میں کوئی کسر باقی اٹھانے نہیں رکھی، حالی کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے۔ اردو تنقید کی رو سے حالی کے اثرات اردو ادب پر کچھ اس طرح سے ہیں:

”مقدمہ شعر و شاعری حالی کے دیوان کا مقدمہ ہے۔ اور اردو میں اصول تنقید کی سب سے پہلی کتاب ہونے کی حیثیت سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس میں انہوں نے شعر و شاعری کے مختلف پہلوؤں کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے اور اس کی اہمیت ذہن نشین کرائی ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری میں شاعری کی ماہیت، حیات اور سماج سے اس کا تعلق، اس کے لوازم، زبان کے مسائل اور اردو شاعری کے اصناف سخن، ان کے عیوب و محاسن، اور اصلاح پر بہت معقول اور مفکرانہ بحث کی ہے۔“ (۴)

اردو تنقید کا سہرا حالی کے سر سجایا جاتا ہے کہ حالی نے اردو شاعری کو جدت آمیز کیا اور شعرا کی توجہ ان موضوعات کی طرف دلائی جو زندگی سے متعلق ہیں مگر ہمارے ناقدین ان جزئیات کی طرف توجہ دینا مناسب خیال نہیں کرتے جو اس تنقید پارے میں برتے گئے ہیں، ان ہی نکات کی سیاق کو مد نظر رکھ کر درست اور منطقی نتائج مرتب کیے جاسکتے ہیں۔ حالی

کے مقدمے سے کچھ نکات ملاحظہ کریں کہ اس تحریر کا مدعا حالی سمیت کسی بھی مصنف کو کمتر یا ملک دشمن ثابت کرنا نہیں ہے بلکہ ان داخلی خارجی عوامل پر توجہ مرکوز کرنا ہے جو ہمارے ناقدین اور اجتماعی دلش کے نمائندہ ذہنوں سے اوجھل رہے، جس کے حاصلات کے اثرات ہماری اجتماعی فکر پر مرتب ہوئے ہیں:

”صرف نیچر کا مطالعہ اور معلومات کا ذخیرہ جمع کر لینا ہی شاعر کا کام نہیں ہے بلکہ ہر ایک شے کی روح میں جو خاصیتیں ہیں ان کا انتخاب کرنا اور ان کی تصویر کھینچنا شاعر کا کام ہے۔ مثلاً شاعر نباتات اور پھول اور پھل لو اس نظر سے نہیں دیکھتا جس نظر سے کہ ایک محقق علم نباتات کو دیکھتا ہے..... شاعر کی ذات میں جیسا کہ اوپر بیان ہوا تین وصف متحقق ہونے ضرور ہیں ایک وہی یعنی تحلیل یا امیجیشن اور دوسری یعنی صحیفہ فطرت کے مطالعہ کی عادت اور الفاظ پر قدرت..... اب وہ خصوصیتیں بیان کرنی ہیں جو دنیا کے تمام مقبول شاعروں کے کلام میں پائی عموماً پائی جاتی ہیں۔ ملٹن نے ان کو چند مختصر لفظوں میں بیان کیا ہے وہ کہتا ہے کہ شعر کی خوبی یہ ہے کہ سادہ ہو، جوش سے بھرا ہوا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو..... اگرچہ بعض دیوان اور مثنویاں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے سراسر لغو خیالات اور بے ہودہ مضامین سے بھری ہوئی ہیں۔ لیکن جو لوگ محض زبان سے غرض رکھتے ہیں ان کو خیالات کی لغویت اور مضامین کی بیہودگی سے اغماض کرنا چاہیے..... غزل کی حالت فی زمانہ نہایت ابتر ہے۔ وہ محض ایک بے سود اور سوراخ کا رصنف معلوم ہوتی ہے..... اردو میں عام طور پر یہ رنگ تو ایک آدھ کے سوا کسی غزل میں کبھی پیدا نہیں ہوا۔ لیکن عاشقانہ خیالات، نیچرل اور سادہ طور پر ادا کرنے والے اردو غزل گویوں کے ہر طبقہ میں کم و بیش ہوتے رہے ہیں مگر افسوس ہے کہ اب یہ رنگ بھی روز بروز مٹتا جاتا ہے۔ الفاظ میں صنعت اور خیالات میں رکاکت و سخافت یو مافیو ما بڑھتی جاتی ہے..... آج کل یورپ میں شاعر کے کمال کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاتا ہے کہ اس نے اور شعرا سے کس قدر زیادہ الفاظ خوش سلیقگی اور سائنسگی سے استعمال کیے ہیں۔“ (۵)

حالی کے مقدمے کی حیثیت اور اس میں بیان کردہ نکات کی اصلیت کا مطالعہ تاریخی تناظر میں بعد میں پیش کیا جاتا ہے پہلے ہم ادبی سماجیات کے متفرق نکات، تنقیدی عمل بارے اس کی ترجیحات کو سمجھنے کی سعی کرتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی میں پوری طاقت اور نظری و عملی قوت کے ساتھ فرانسیسی ادب سے رواج پانے والی ادبی سماجیات کی تحریک، جس نے آگے چل کر انگریزی، فرانسیسی، جرمن، لاطینی اور روسی شاعری، فلشن کے کلاسیکی ادب کا ازسرنو جائزہ لیا اور ان معاشروں میں تخلیق کیے گئے ادب کے وسیلہ سے یہاں رائج مذہبی، ثقافتی، سیاسی، جمہوری نظام کو پھر سے دیکھا اور سمجھا۔ ادبی سماجیاتی ڈسکورس نے ان معاشروں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی بارے نئی سچائیاں آشکار کیں، اس بھرپور تنقیدی فکر نے آج تک اردو دنیا میں اس طرح سے اپنی جگہ نہ بنائی جس کا وہ استحقاق رکھتی ہے۔ آج بھی ہمارا نقاد ادب کا تجزیہ کلاسیکی نکات اور سطحی سرخیوں کی بنیاد پر کرتا ہے، سوائے اس قلیل مدت کے جب تنقید کو اشتراکی اور ترقی پرست ناقدین نے کارل مارکس، لینن،

لوکاچ اور دیگر اشتراکی مفکرین کی نگاہ سے ادب کی تفہیم کے بنیادی آلہ کار (Tool) کے طور پر استعمال کیا اور اس کے نمائندہ نکات کی مدد سے اپنے معاشروں کی سیاسی سماجی، ادبی، انفرادی، اجتماعی زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی گئی، یوں اشتراکی فکر نے ایک طرف ناقد کو تجزیہ کے لئے راہ بھائی تو دوسری طرف تخلیق کار کو اپنے سماج کی متنوع تمثال کو ادب کے قالب میں ڈھال کر پیش کرنے کی تربیت دی۔ اس فکری نئے پن میں سگمنڈ فرائیڈ کی تحلیل نفسی کا تذکرہ بھی لازم ہے جس میں جنس اور جنسی نفسیات کے تڑکے نے کم از کم اردو دنیا کے تخلیق کار اور قاری دونوں کو بڑی حد تک متاثر کیا اور پہلے سے قائم اخلاقی معیارات کے ستون ایک وقت کے لئے جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنے کی اپنے تئیں شدید کوشش کی، مگر یہ ادبی منظر نامہ وقت کے ساتھ اپنی توانائی کھوتا رہا اور آج اردو ادب کے پاس تخلیق کار کی شخصیت اور اس کے تخلیقی کارناموں کو نشان زد کرنے کے لئے ترجمہ شدہ مضامین کے انباروں سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم دراوڑی زبانوں سے کٹ چکے ہیں۔ عربی تو مدارس میں موجود ہے لیکن نوآبادیاتی اسکیم کے تحت مذہبی نمائندگان اور اوسط طبقے کے دانشور کے درمیان فاصلے مسلسل بڑھ رہے ہیں۔ ہندی، سنسکرت اور دیگر قدیم ہندوستانی زبانیں جو کسی نہ کسی حوالے سے ہمارے اجتماعی لاشعور کی محافظ ہیں، ہمارے معاشرے سے بہت دور ہیں۔ ادبی سماجیاتی مفکر ایک زبان، اس میں تخلیق کردہ ادب اور اس کے عوام کے انفرادی اور اجتماعی تمثال کو اس طرح باہم آمیز کرتا ہے کہ ان سے بننے والی تمثال زبان، قوم، نظریات کی محافظ اور پیش کار کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ ادبی سماجیات کے نظریات کی رو سے ایک نقاد / تخلیق کار / ادبی سماجیاتی مفکر / دانشور کو اس طرح سے اشیاء کو سوچنا چاہیے:

- ۱۔ ادبی سماجیاتی نقاد تخلیقی متون سے مفہیم کے استخراج میں آزاد ہے۔
- ۲۔ ادبی سماجیاتی نقاد ادبی متن کے مطالعہ سے مختلف مصنفین کے طبقاتی شعور اور اس کی نوعیت پر توجہ کرتا ہے۔
- ۳۔ تخلیق اور سماج کے مابین واقعاتی مشابہت کا سراغ، ادبی سماجیاتی مفکر کا تنقیدی وظیفہ ہے۔
- ۴۔ یہ تنقیدی پیراڈائم (ادبی سماجیات) مختلف اصناف کے مصنفین کی طبقہ داری تقسیم کر کے، طبقاتی تفریق کی بنیاد پر لکھے متون کی معنوی اور اخلاقیاتی تشریح کرے گا۔
- ۵۔ مختلف ادوار کے ادب میں معاصر دور کی عکاسی اور اس دور کے بعد اس کے معنی و مفہیم کا تعین کرنا، ادبی سماجیاتی نقاد کی خصوصیت ہے۔
- ۶۔ سرکاری، نیم سرکاری، ادبی ادارے اور تنظیمیں ایک تخلیق کار کی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اس کا تجزیہ ادبی سماجیاتی نقاد کی ذمہ داری ہے۔
- ۷۔ ادبی سماجیات تخلیق سے سماج کی طرف جانے اور سماج سے تخلیق کی طرف لوٹنے کا نام ہے۔
- ۸۔ ادبی سماجیات تخلیق متون سے ان مماثلتوں کو تلاش کرتی ہے جن سے تخلیقی وحدت قائم ہو سکتی ہو اور جو تخلیق کے جمالیاتی پہلو اور ادبی شعور سازی کے لیے معاون ثابت ہو سکتے ہوں۔
- ۹۔ تخلیق پارے میں عالمی وژن کی ساخت اور تخلیق کے اندر موجزن ہوتی دنیا کی ساخت میں مشابہت کی تلاش اور نشاندہی ادبی سماجیاتی مفکر کی ذمہ داری ہے۔

۱۰۔ ادبی سماجیاتی مفکر کسی دور کے ادب کے مطالعہ کے بعد اس دور کی مادی زندگی، سماجی، ڈھانچے اور غالب رجحانات کو ایک حد تک دوبارہ تعمیر کرتا ہے کہ تخلیق کار اصل کی نقالی سے قاری کو اصل صورت حال کا شریک بناتا ہے جس میں تخیل کی طاقت اس نقل کو اصل سے درجہ بہتر بنا کر پیش کرتی ہے۔ اس عمل میں کسی تخلیق کار کوئی ایک پہلو، سماجی انسان، اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی پوری صورت حال کو بیان نہیں کر سکتا، ایک فن پارے کو اس کلیت کی ساخت میں ایک جزو سمجھنا چاہتا ہے۔

۱۱۔ ادبی سماجیاتی مفکر کے لیے اصناف کی اہمیت بھی اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے خیال میں تخلیق عمل کا ایک پہلو صنف کا چناؤ ہے۔

ان نکات کو سامنے رکھا جائے تو اردو ادب کی پوری تاریخ کو نئے سرے سے لکھنا ہوگا تاکہ بہتر سے بہتر نتائج کی تخریج ممکن ہو سکے۔

اردو ادب کی جھولی میں تخلیقی رنگوں کا متنوع اور اطمینان بخش آمیزہ موجود ہے جس کے حوالے سے ہم میں سے اکثر، اس ادب کی معنویت اور اثر انگیزی کے باب میں معذرت خواہ نہ رویہ اختیار کرتے ہیں جبکہ درحقیقت نظم اور ناول کی صورت اردو ادب آج دنیا کے نمائندہ متون میں اپنی جگہ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے ان ناقدین کو چھوڑ کر جو آج بھی انگریز کی ریل کی پٹری پر اس ذہنی سرشاری کے ساتھ خراماں خراماں ٹھل رہے ہیں جو ملازم کو مالک کی نہایت مہنگی موٹر میں بیٹھ کر محسوس ہوتا ہے اور ان کے صاف شفاف تالو اور نیکی سے بھر پور آنکھوں کی پتلیوں میں محمود غزنوی کے اندوں کی تاحد نگاہ لمبی قطار میں سونے سے بھرے صندوقوں کی چھن تکلیف کا سبب بنتی ہے اور یوں کل ملا کر ہمارے نقاد کی پینٹنگ خاصی بے رنگ اور بے مقصد ہے کیونکہ اس میں کہیں متن کے حوالے سے پہلے سے ہی نتائج برآمد کیے جا چکے ہیں اور کسی جگہ پر مصنف اور تخلیق کار کے باب میں رائے قائم کی جا چکی ہے، یہی سبب ہے کہ آج کی تنقید مد رسانہ ضروریات کی کوکھ سے جنم لیتی ہے اور اسی ماحول میں پیدا ہونے کی وجہ سے معاشرے کی روح سے مکمل طور پر نا آشنا ہوتی جا رہی ہے، آج بھی ہمارا نقاد ادبی متون کی تشریح کو تنقید گردانتا ہے اور تشریح و توضیح اور تنقید کے درمیان لکیر کھینچنے کو تیار نہیں ہے جبکہ دوسری طرف مغربی ادب کے غبار میں اٹے اور استعمار کے نمائندہ ناقدین ہیں جو استعمار کے نظریات کے تراجم کر کر اپنی ذمہ داری کا حق ادا کرتے ہیں اور پاکستانی قوم کی غلامانہ نفسیات کی پیچیدگی کو مزید الجھاؤ کا شکار کرنے کی استعماری حکمت عملی میں ان کے مددگار ہوتے ہیں یہ وہی ناقدین ہیں جن کے پاس تخلیقی متن کو سماج، تخلیق کار، تخلیق کار کی سماجی ضروریات، سماج کی ادبی ضروریات، ادبی سرپرستی کے اداروں، مادہ پرستی کے متفرق رجحانات اور ایسے دوسرے عوامل پر تجزیاتی رائے قائم کرنے کی بجائے، ان ناقدین کے پاس فن اور شخصیت، ادیب / شاعر اور فن، ادیب / شاعر کی حیات معاشقہ، ادیب / شاعر بطور انسان، ادیب / شاعر بطور شوہر اور ایسے دوسرے مبہم موضوعات ہوتے ہیں جن سے سامنے آنے والے نتائج کو لائبریریوں کی شیلفوں میں گرد و غلاف بنانے کے لئے سینچ دیا جاتا ہے۔ یہ وہ ناقدین ہیں جنہوں نے پاکستانی ادب، ادیب، شاعر اور اس کے معاشرے کے درمیان فکری، سماجی، نظریاتی، اخلاقی پل تعمیر کرنے کی بجائے ان کے اور معاشرے کے درمیان فاصلہ قائم کیا ہے جس نے ادب کی معاشرتی ساکھ کو نقصان پہنچانے کے علاوہ تخلیق کار اور معاشرے کے درمیان اجنبیت اور

لا تعلقی کی فضاء ہموار کی ہے۔ یہ وہی فکری نظام ہے جس نے معاشرے کی یوں تربیت کی کہ شاعر ایسا آدمی ہوتا ہے جو ذہنی طور پر مفلوج ہوتا ہے اور اسی مفلوج ذہن کی وجہ سے وہ شعر کہتا ہے، اسی طرح سماج کی تربیت کی گئی کی شاعر شرابی اور بدکردار ہوتا ہے، غرض شاعر کو ایک بالکل غیر فطری حالت میں پیش کیا جاتا رہا ہے تاکہ شاعر کی حساسیت اور تجزیے کی غیر معمولی صلاحیت کو ناکارہ بنایا جائے۔ یہ لوگ بھول گئے کہ ضیاء کے مارشل لاء کا مقابلہ سب سے پہلی قطار میں کھڑے ہو کر، کوڑے کھا کر، جیلیں بھگت کر شعر انے کیا، یہ فیض اور فراز، حبیب جالب اور صفد سلیم سیال تھے جنہوں نے مارشل لاک کی بیوست کو سب سے پہلے محسوس کیا اور آگے بڑھ کر اس کی راہ رو کی کہ سماج اس کی منفی شدت سے محفوظ رہ سکے۔ رشید امجد، احمد جاوید، منشا یاد، اسلم سراج الدین، احمد داود ایسے نثر نگاروں نے اپنے عہد کے سچ کو لکھا مگر ان کے متون میں موجود سماجی حقیقت نگاری کے پہلو کو کیوں کرید کر سامنے نہیں لایا گیا؟ منٹو کے متن کو جنس کا لبادہ پہنا کر خاص جنسیاتی تملذذ کا نمائندہ کر کے کن ناقدین نے پیش کیا کہ منٹو کا متن کسی بھی سطح پر جنسی نہیں بلکہ سماجی حقیقت نگاری کے ان پہلوؤں سے مملو ہے جن پر نگاہ پڑے ہی اچھا خاصا انسان بھی سرد پڑنے لگتا ہے۔ منٹو کے افسانوں میں ان ناقدین کو کالی شلوار، جو کہ مرد کی سفک نفسیات کو نمائندہ متن ہے بجائے جنسیاتی ہونے کے، نیا قانون، باسط ایسے بے شمار افسانے کیوں دکھائی نہیں پڑتے؟ منٹو کے تصور انسان اور پھر ان متون کی تخلیق میں معاون حالات، منٹو کے عہد کی سیاسی صورت حال، منٹو کی معاشی حیثیت، منٹو کے معاشی ذرائع، منٹو کے گرد موجود افراد کی مزاجوں بارے کھل کر کوئی نقاد کب لکھے گا اور اسی اصول پر اردو فکشن کی معناتی تشریح اور اس میں موجود کائنات کی حقیقی تمثالیں کون قاری کے سامنے پیش کرے گا؟ کون بتائے گا کہ کشور کی شخصیت کی نمائندگی محض چھین چھری سے نہیں ہوتی بلکہ کشور کا قد کا ٹھہر کا تعین اس کی نظم و نثر کے متنی مطالعات کے علاوہ اس کے ماحول، اس ماحول میں موجود لاج و عمد عناصر کے تجزیات سے ممکن بنایا جاسکتا ہے۔ ایک کامیاب حکمران کے لئے ضروری ہے کہ وہ معاشرے میں تخلیق کار کی شناخت کو مشکوک بنائے کہ وہی اس کے اقتدار اور منہ زور حاکمانہ خصلت کے لئے خطرہ ثابت ہو سکتا ہے لہذا ابادشاہ ہوں یا نوآبادیات کے فروغ کے خواہاں جمہوری مغالطہ عام کرتے جدید استعمار نمائندہ فلسفی، سب نے ادیب اور شاعر کو اپنے ایجنڈے کی تکمیل کے لئے کئی طرح سے خلط ملط کر کے اور اس کی شخصیت و صلاحیت کو مجروح کر کے پیش کیا اور کمال ہے ہمارے ناقد کا جس نے ان شکلوں اور حالتوں کو بڑی تبدیلیوں کے بنا قبول کر لیا۔ اردو تنقید کی حد تک حسن عسکری کی صورت کچھ سوالات اٹھانے کی کوشش ضرور کی گئی مگر عسکری صاحب نے بھی اپنے عہد کے ادب کو سماجی تفاعل کے ساتھ ری کر بیٹ نہیں کیا جو کہ ناقد کی بنیادی ذمہ داریوں میں اولین ذمہ داری ہے۔ اردو کے ناقدین نے اپنے تئیں پورے اخلاص اور اپنی بھرپور صلاحیت سے مغرب کے پیچیدہ، بے سمت، مشین پرستانہ، مادیت پرست تمدن کو ہندوستان کے رومانوی، سادہ اور مذہبی نظام حیات پر برتر ثابت کرنے میں صرف کردی حتیٰ کہ یہ بھی نہ دیکھا کہ اردو ادب کا بنیادی جوہر کیا ہے آج بھی گذشتہ صدی کے ادب کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں تخلیق کار نے ہندوستان کو، اس کے معاشرتی نظام کو، اس کے فرد کی انفرادی جمالیات کو، اس کے سماج کی اجتماعی دانش کو مذہب پرست، سادہ، رومانوی اور خال خال آزادی پسند دکھایا ہے۔ انگریزی ادب کی تنقیدی روایت میں پائے جانے والے اسی نوعیت کے مسائل کی وجہ سے ادبی سماجیاتی مفکرین نے انگریزی ادب کی تاریخ کا از سر نو زہ لیا اور کلاسیکی ناقدین کے تجزیات کو نشان زد کر کے نئے نتائج کشید کئے۔

اس طرح ادبی سماجیاتی ناقدین نے مغربی ادب کو نبی راہیں بھنائیں، جس کی آج ہمارے ادب کو ضرورت ہے مگر اہم نکتہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے ادبی ورثہ میں چینی اجتماعی دانش کو محض انگریزی ادب کی راہ نمائے میں اجاگر نہیں کرنا بلکہ اپنا رابطہ ہندو اسلامی علم و ادب، علامت اور استعارے کی روایت کے ساتھ بھی جوڑنا ہے۔ ادبی سماجیاتی ناقدین نے ادبی متون میں اشرافیہ کے کرداروں کو تنقید کا نشانہ بنایا، ان کی موجودگی کو اپنے عہد سے متصادم قرار دیا، اپنے سماج کے متحرک کرداروں جیسے کسان، مزدور، اوسط درجے کے دفتری ملازمین، گھروں میں کام کرنے والی خواتین کی ادب میں نمائندگی پر زور دیا، اور یہ موقف اپنایا کہ ترقی یافتہ مشینی زندگی کے عہد کے انسان کو ہی اس کے ادب میں جگہ دی جانی چاہیے، اشرافیہ کے کردار کو محدود کیا جانا چاہیے تاکہ ادب معاشرتی زندگی کا حقیقی نمائندہ بن سکے۔ ان ناقدین نے ادب کی ترویج میں اصناف کی اہمیت پر توجہ مرکوز کی اور امریکہ کی کچھ ریاستوں کو ناول کی تخلیق کے لیے بہترین ریاستیں قرار دیا۔ بیسویں صدی کی ادبی تحریکیں بنیادی فکری نظام کے حوالے سے ادبی سماجیاتی تفکر کی ذیلی شاخیں محسوس ہوتی ہیں کیونکہ ان سب تحریکوں، نظریات اور نکتہ ہائے نگاہ کو یکجا کیا جائے اور ان کے عناصر کی جانچ پرکھ کی جائے تو یہ سب کے سب ادبی سماجیاتی تحریک کی کوکھ سے جنم لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ نوکلاسیکی مباحث ہوں، تمثال کا رشا عروں کا کلب ہو، ہیئت پرست تخلیق کاروں کا اعلامیہ ہو، غرض ادبی سماجیاتی تحریک اپنے دامن میں وہ سب نکات سمیٹے ہوئے ہے جن کی مدد سے کسی بھی ادب پارے کی تفہیم کے امکانات کو دریافت کیا جاسکتا ہے۔ ادبی سماجیاتی تحریک کے اہم ترین نکتہ کہ ادب کی تخلیق میں اس معاشرے اور ریاست کے ادبی ادارے خواہ وہ سرکاری سرپرستی میں ہوں یا نجی سطح پر اپنا کام کر رہے ہوں، کردار ادا کرتے ہیں ایک نیا اور اثر انگیز پہلو ہے۔ اس کے عملی مظاہرے ہر معاشرے میں دیکھے جاسکتے ہیں جوں کون نہیں جانتا کہ پاکستان میں ضیاء کے مارشل لاء میں کون سے ادیب شعرا کے متون کی اشاعت اکادمی ادبیات سمیت کسی بھی سرکاری ادارے سے ممکن نہیں تھی۔ ادبی مفکر کے لیے یہ پہلو فکر کے کئی دروا کرتا ہے کہ جن ادباء کو کسی استعماری، نوآبادی، مارشل لائی عہد میں حکومتی چھتری تلے اشاعت کی سہولت میسر ہوتی ہے تو اس کے معنی کیا ہوتے ہیں اسی طرح جن ادبی، سیاسی، سماجی تخلیقات پر نعتیہ ادب ادارے، این جی اوز انعام و اکرام کی بارش کرتے ہیں اس کے اسباب کیا ہوتے ہیں؟ چند برس اور ہر سالہ نقاط نے نظم نمبر شائع کیا مگر اس میں فیض احمد فیض کو اردو نظم کی روایت میں شامل نہیں کیا گیا اور نہ ہی اس بابت مدیر نے کوئی خاص پہلو اپنے دیباچہ نمائندہ میں بیان کیا مگر اس کے بعد رسالے وک ایک خاص گروہ کی طرف سے جو پذیرائی ملی وہ کسی بھی سنجیدہ ناقد کے لیے دل چسپی کا سامان ہونے کے علاوہ مدیر کی ترجیحات اور ان ترجیحات کے تعین میں معاشرتی افراد کے کردار کو سامنے لاتی ہے اور جب جب کسی بھی معاشرے میں ادب کی تشریح ادبی قانون کی بجائے معاشرتی اداروں کی خوشنودی کے لیے کی جائے گی تو اس میں مسائل کا درآنا فطری عمل ہے۔ اردو متون کی تشریح و توضیح میں مختلف ادبی اداروں کی کارکردگی کو شامل کر لیا جائے تو ہمارے سامنے اپنے معاشرے، اس کے فرد، اس فرد کی پسند ناپسند، تخلیق کار کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سمیت بہت سے نئے پہلو سامنے آئیں گے۔ ادبی ناقدین کو سائنس دان کا سا تفکر، تجربہ اور بار بار مشاہدہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سب کے علاوہ یہ ادب کے طفیل اجتماع کی نفسیات معلوم کرنے اور سماجی اصول سازی میں ادب کی اہمیت پر بات کرتے ہیں اور ادبی تخلیق میں سرکاری اور نجی اداروں کے کردار کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔

ادبی متن خواہ وہ شعر کی صورت میں ہو یا فکشن کے پیرائے میں خود ایک سماج ہوتا ہے جس کو تخلیق کار اپنے تخیل کی اڑان اور وجدان کی جذباتی آنچ کی حدت سے تخلیق کرتا ہے۔ نقاد کا کام اس تخلیقی متن میں موجود جذباتی فضاء اور مثالیت بنیاد ماحول کو عقلی دلیل اور سماجی تفاعل کے تناظر میں عام آدمی کی تفہیم کے مطابق بیان کرنا ہے۔ تنقید کے عمومی تصورات ادبی متون کی ایسی ہی تشریحات سے مملو ہیں۔ ادبی سماجیات کا امتیاز تخلیق کار، نقاد اور معاشرے کے درمیان واضح اور با معنی ربط قائم کرنا ہے۔ اس عمل میں تخلیق کار کی شخصیت، اس کے نفسیاتی مظاہر کے ساتھ ساتھ تخلیق کار کے سماجی اور سیاسی حوالوں کو، پوری جزئیاتی ترتیب کے ساتھ استعمال میں لایا جاتا ہے کہ تخلیق ایک ہزار رنگا آزاد پرندہ ہے جس کی کلی تفہیم کو ان ہزار رنگوں کی باہمی آمیزش کے تمام تر امکانات کو نگاہ میں رکھنا از حد ضروری ہے۔ اردو ادب و تنقید حالی سے پہلے اور بعد کے دو بنیادی رنگوں کے ساتھ اپنی ایک مکمل شناخت بنا چکا ہے جس میں بنیادی کردار (بعد از حالی) انگریز تفکر کا ہے۔ آج کے اردو ادیب اور نقاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ تاریخ کے بہاو میں اس گمشدہ کڑی کو تلاش کرے جو انگریز کی سیاسی اور استعماری ضرورت کے باعث کہیں کھو گئی یا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کے طنطنے میں نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ ان دیرھ سو برسوں میں ہم حالی کے مقدمے اور سادگی، اصلیت، جوش کے ولولے کے اس قدر اسیر ہوئے کہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور متفرق غلط فہمیوں کو راہ فراہم کرتے رہے، اس سارے عمل میں مغربی فکریات کا غلبہ اس قدر حاوی ہو گیا کہ خود ہندوستانی ادبی منظر نامہ اپنے فکری اور تخلیقی نقوش کے ساتھ بہت پیچھے رہ گئے۔

ادبی سماجیات ایک ایسا فکری نظام ہے جو تخلیقی متن کو سماجی ضروریات کو سامنے رکھ کر سمجھنے کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔ اس فکر سے جڑے ناقدین نے ادب کے خالص ڈھانچے کے ساتھ فلم، ٹانک رنگ منچ کی روایت کو پوری شدت کے ساتھ ادبی تنقید کا سنجیدہ موضوع بنایا اور نئے نتائج کے استخراج سے ادب اور سماج کے مابین نئے اور پرانے رشتوں کا اسر نو جائزہ لیا۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے بونا پارٹ کی تانا شاہی کے خلاف آواز بلند کی حتیٰ کہ جلا وطنی جیسے جاں سوز آزار کا سامنا بھی کیا۔ یہ فکر مغرب اور روس کے فکری نظام میں اس قدر گہرائی تک پیوست ہے لیکن کمال حیرت ہے کہ اس علمی ڈسکورس کے نشانات اردو ادب میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ گزشتہ تیس برس سے پے در پے مغربی فکر کے تراجم کرنے والے ”ناقدین“ کو، ادبی سماجیات جیسا اہم اور تخلیق کار اور نقاد کے فکری دائرے سے منسلک یہ نظام تفکر دکھائی نہیں دیا جس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ادبی سماجیات اپنے وسیع علمی ڈھانچے میں دیگر فنی اور فکری استفسارات کے ساتھ ساتھ ادب سے کسی عہد اور زمان کی سیاسی ثقافتی اشکال کا سنجیدہ مطالعہ کرنے کا مطالبہ کرتی ہے جو ادیب کی تربیت کے علاوہ نقاد اور معاشرے کے درمیان بھی پل کا کام کرتا ہے۔ اردو ادب کی حد تک اس موضوع پر جتنا ایک کام سنجیدہ صورت میں ہوا ہے وہ سرحدی لکیر کے اس طرف ہے۔ ادبی سماجیات کی نظریاتی تفہیم اور اس کے ماہرین بارے تفصیلی کام انجمن ترقی اردو، دہلی سے اردو روپ میں شائع ہونے والی کتاب ”ادب کی سماجیات: تصور اور تعبیر“ ہے جو ہندی زبان سے سرور الہدی نے اردو میں ترجمہ کی ہے۔ ہندی میں اس کتاب کا عنوان ”ساہتیہ کے سماج شاستر کی بھومیکا“ ہے۔ یہ کتاب اردو میں ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر محمد حسن کی کتاب ”ادبی سماجیات“ ہے جس میں زمانی ترتیب سے اردو کی نشوونما کے ساتھ ساتھ اردو کے تخلیقی متن کا ادبی سماجیاتی تجزیہ کیا گیا ہے لیکن ابتدائی کام ہونے کے سبب سے اس کتاب میں ادب کے

سماجیاتی مزاج کی تفہیم اس علمی اور تہذیبی پائے کی نہیں ہے جس استدلال کے ساتھ، مادام اسٹیل اور ان کے بعد کے ادبی سماجیاتی مفکرین نے فرانسیسی، جرمن، روسی اور انگریزی ادب کے تجزیات سے نئی تنقیدی تاریخ رقم کی ہے۔

یہ سچائی ادب سے جڑا ہر فرد جانتا ہے کہ مغرب میں ادبی تحریکوں کے ابتدائی نمونے فن مصوری میں جلوہ گر ہوئے۔ تاریخی جدل میں کلاسیکیت کی معلوم تاریخ سے ان فنی، فکری اور فلسفیانہ تحریکوں کا آغاز ہوا جو اپنے ارتقائی تحریک میں آج بھی جاری و ساری ہے۔ کلاسیکیت کے تفکر کی چھتری تلے پختہ ادب اور مصوری نے اسلوب، حسن ترتیب، تعظیم و تکریم، اطمینان و سکون (۶) کے تخلیقی نشانات کو اپنے قاری کے روبرو پیش کیا۔ کلاسزم، رے نیساں، میٹازم، پری رومینٹزم، نیو کلاسزم، امپریئل ازم، کالونیل ازم، رومانٹزم، کیوب ازم، رئیل ازم، امپریشن ازم، نیو امپریشن ازم، سمبل ازم، ایکس امپریشن ازم، فیوچر ازم، پوسٹ امپریشن ازم، کنسٹرکٹو ازم، پرسیماٹزم، ڈاڈا ازم، سرائیل ازم، نیو رومانٹزم، لٹریری سوشل ازم، ایسٹریٹ ازم، سپر رئیل ازم، امیجزم، پوسٹ امیجزم، فارل ازم، پوسٹ فارل ازم، ماڈرن ازم، پوسٹ ماڈرن ازم، سٹرکچر ازم، پوسٹ سٹرکچر ازم، فیمینزم، پوسٹ فیمینزم اور ایسے کئی فکری دائروں میں کلاک وائر سفر کرتا ہوا آج فکر و خیال کے کئی نئے پرانے منطقوں کے درمیان کئی پل بنا کر آگے بڑھ رہا ہے۔ جس کے سبب سے ادب زندگی کے کئی ایک سوالوں کے ساتھ اپنے باہمی ربط کے ساتھ ساتھ فلسفے اور اخلاقیات کے ساتھ اپنے رشتوں کی ناگزیری کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ ان ہی رشتوں کی ایک نئی بوطیقہ ادبی سماجیات ہے جو تخلیقی سوتوں کی تشکیل نو اور ان کی تخیلی کارفرمائی میں عقل و وجدان کی آمیزش سے نئی کائنات بنا کر قاری کے فکر و خیال کی تربیت تو کرتی ہی ہے لیکن اس کے علاوہ یہ تخلیق کار کو بھی کئی نئے راہ بھاتی ہے کہ وہ اپنی تخلیقی کائنات کو رنگ رنگ متحرک مثالوں اور ہیتی تکنیکی مزاج میں رنگ آمیزی سے منفرد بنانے کے ساتھ ساتھ ادبی تاریخ نگاری میں اپنا کردار ادا کرے۔ لفظ مرکزیت (logocentrism) سے مراد فکر کا وہ نظام ہے جو زبان کے مابعد طبعیاتی / الہامی کردار کے تصور سے برآمد ہوا ہے۔ زبان کے الہامی کردار سے مراد یہ کہ مواد / وجدان / تجربہ جو ایک مابعد طبعیاتی غیر حسی وحدت یا وجود ہے ایک حسی (اصلاصوتی) معمول میں اپنا اظہار کرتا ہے اور احضار / انکشاف اور ترسیل کے اس معمول میں بھی ماقبل سے موجود تجربے / وجدان / معنی کی مناسبت سے ترمیم و تنسیخ کے ذریعے اسے، اس الہامی / مابعد الطبعیاتی مواد کی ترسیل کا اہل بنایا جاتا ہے یعنی زبان ایک مابعد الطبعیاتی مواد کی محکوم / پابند ہوتی ہے۔ (۷)

اردو میں جدید علوم اور ان کی ترویج کے متفرق موضوعات کو مغرب کے تجارتی مقاصد کے سبب سے ہندوستان درآمد ہونا اور پھر اپنی روز افزوں بڑھتی سیاسی اور کاروباری ضروریات کے لیے مقامیت کے ساتھ گھلنے ملنے کی مختلف کاوشوں کو قرار دیا جاتا ہے۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ انگریز سامراج نے کئی طریقوں سے ہندوستانی عوام پر اپنا اعتماد قائم کرنے کی کوشش کی، جس کا مقصد یہاں اپنے سیاسی مفادات کا تحفظ ہی تھا اور ایک بیرونی حملہ آور سے اس کے علاوہ کوئی توقع رکھنا بذات خود ایک احمقانہ عمل ہے۔ انگریز راج کے حوالے سے معذرت خواہانہ رویہ رکھنے والے زیادتی تر افراد ریل کے نظام کے قیام اور ترقی کو مغربی نوآبادیات کی برکات میں شمار کرتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ اس زمانے میں انگریز نے اس نظام موصلاات کے توسط سے ایک طرف خام مال کی ترسیل کو آسان بنایا تو ساتھ ہی سول اور ملٹری اسٹبلشمنٹ کی نقل و حرکت کے لئے ایک موثر وسیلہ کے طور پر استعمال کیا تا کہ وہ سب سے پہلے اپنے معاشی مفادات کا

تحفظ کر سکے۔ اس صورت حال کی ایک نہایت سادہ سی مثال سے دیکھیں کہ نو دہائیوں تک اس خطے میں صنعت و حرفت اور تکنالوجی کے متفرق ذرائع کو فروغ دینے والے انگریزوں نے مختلف سائنسی اور مشینی تکنالوجی کی ذیل میں فنی مہارت اور مختلف مشینوں کی جانچ پڑتال کے حوالے سے ایک بھی مقامی باشندہ تیار نہ کیا۔ جب بھی ضرورت پیش آئی مختلف ماہرین کے لیے برطانیہ اور دیگر حکمران طبقات سے خدمات حاصل کی گئیں اس صورت کو آج کے سامراجی تناظر میں دیکھا جائے تو یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ یہ تکنیکی ماہرین ہماری معاوضوں اور بے شایستگیات کے بدلے یہاں اپنی خدمات فراہم کرتے ہوئے ہونگے جو سب کی سب ادائیگیاں ہمارے وسائل سے کی جاتی ہوگی۔ سادہ ترین الفاظ میں نوآبادیات کی بنیادی خوبی ہی پرت در پرت ملفوف / ابہامی صورت حال کو پیدا کرنا اور اپنی روزمرہ ضروریات کے تحت اس کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر بنانا ہوتا ہے۔ یہی ظاہری صورت حال دکھا کر استعمار اپنے فیصلے کرتا ہے اور اپنے راج کو مختلف اندازوں پر مستحکم کرتا ہے۔ جس کی ظاہری اور اوپری حالتوں کے تجزیے سے کبھی درست معلومات تک رسائی ممکن نہیں ہوتی اور ایسا ہی انگریز سامراج نے ہندوستان میں ترقی کے گڈی کاغذ میں لپٹی استحصالیت کے فروغ سے کیا جس کا واحد مقصد اپنے ذاتی مفادات کا تحفظ اور مالی و معاشی وسائل پر ہر صورت اپنا اجارہ قائم رکھنا ہوتا تھا جس کا اجمالی جائزہ اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔

اردو میں ادبی تاریخ نویسی کے محرکات پر نظر کی جائے تو بہت دل چسپ لیکن مایوس کن نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اردو تاریخ نویسوں نے اپنی تاریخ کی ترتیب و تنظیم اور ابواب بندی پر توبات کی ہوتی ہے لیکن ان تواریخ میں مخصوص تاریخ نویسی کے علمی اسباب اور اس سے سامنے آنے والے نتائج کا تذکرہ نہیں کیا جاتا، اس پر تشہاری ایک دو تاریخ تو جواب برائے جواب کے فارمولے پر لکھی گئی ہیں اور خود سوچیں جو تواریخ اپنے سے متوازی فکر کے گروہ کی کل سیدھی کرنے کو لکھی گئی ہوں تو ان میں پیش کردہ مواد کی صحت اور سب سے بڑھ کر متوازن انداز میں معاشرتی امور کی نشاندہی کا کس قدر خیال رکھا گیا ہوگا۔ ادبی تاریخ نویسی کے جدید رجحانات، مادہ پرست معاشرتی نفسیات، ادب کے سماجی زندگی پر اثرات یا اس نوعیت کے کسی سوال پر بات نہیں کی جائے گی تو کوئی بھی ادبی تاریخ ادبی متون کی درست شناخت کا کام کس طور کر سکتی ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ ”وہی تاریخ کامیاب ہوگی جو اردو ادب کی ابتدا اور ترقی کے مختلف مدارج کو صحیح اور روشن طور پر واضح کر سکے اور اس کی ابتداء اور ترقی کے اسباب، سیاسی، تاریخی، معاشرتی اور ادبی اسباب تفصیل کے ساتھ بیان کر سکے۔“ (۸) اپنی اس رائے میں کلیم الدین احمد نے کوئی صاف موقف اختیار نہیں کیا بلکہ ادبی تاریخ نگاری کے لیے کچھ اصول بیان کئے ہیں۔ کلیم الدین احمد سمیت کوئی بھی نقاد اردو کی حد تک تاریخ نگار کو ادبی سماجیاتی مباحث اور اس کے اطلاقی نکات سے استفادے کی صلاح نہیں دیتا۔ آج اشد ضرورت ہے کہ اردو ادب کی روایت کو تنقیدی سنجیدگی کے ساتھ از سر نو مرتب کیا جائے اور خاص کوشش کی جائے کہ وہ کڑیاں جو تاریخی عمل کے دوران سیاسی سماجی تفاعل، مذہبی تعصب، قومی نسلی امتیازات سمیت کسی بھی سبب سے گمشدہ ہیں، ان کو باہم ملایا جائے اور اپنے ادب سے بننے والی تمثال کو مکمل کیا جائے کہ یہی مکمل تمثال ایک طرف ہماری اجتماعی دانش کی نمائندگی کرے گی تو دوسری طرف ہمارے معاشرے، اس کے افراد، اس کے سیاسی سماجی تفاعل کی شناخت کا فریضہ سرانجام دے گی اور ہم اپنے ادب کو دنیا کے نمائندہ ادبی متون کے ساتھ پیش کرنے کا اعتماد حاصل کر سکیں گے۔

حوالہ جات

- ۱۔ عمران ازفر، ادب کی سماجیات: تصور اور تعبیر، (ملتان: بکس اینڈ ریڈرز، ۲۰۲۰ء)، ص ۱۱۱
- ۲۔ علمدار بخاری، جدید ادب کا سیاق، ایک پس نو آبادیاتی مطالعہ، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۹ء)، ص ۲۲-۲۵
- ۳۔ روش ندیم، بیسویں صدی کے اردو ادب میں عورت کے حقیقت پسندانہ تصور کا سیاسی سماجی مطالعہ، مضمون: دریافت، شمارہ نمبر ۱، جون تا جنوری ۲۰۱۷ء، ص ۴۸
- ۴۔ عبادت بریلوی، اردو تنقید کا ارتقاء، (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۱ء)، ص ۱۵۲
- ۵۔ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، (سرگودھا: شعبہ اردو یونیورسٹی آف سرگودھا، ۲۰۱۶ء)، مرتبین: شاہد نواز، محمد نعیم، ص ۴۸-۱۴۰
- ۶۔ شمیم شوکت، شوکت محمود، مغرب میں فن مصوری کی تحریکیں، (لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۳
- ۷۔ افضال حسین قاضی، تحریر اساس تنقید، (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۲ء)، ص ۵
- ۸۔ کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر، (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۲ء)، ص ۶۲

